Al-Mīthāq *(Research Journal of Islamic Theology)*
ISSN: 2791-0989 (P), 2791-0997 (E)
Volume 03, **Issue** 02, July-September 2024, **PP**: 25-40
Open Access at: https://almithaqjournal.org/

Article QR

مغربیت میں عقلیت پسندی وردّ مذہب اور کلیسیائی انتقادی مباحث

The Critique of Religion and the Church in Western Rationalist Thought: Critical Perspectives and Debates

1. Samreen Akram samreenakram97@gmail.com	*Ph. D Scholar, Department of Islamic Studies, Government Colllege University, Faisalabad.*
2. Dr. Humayun Abbas Shams drhumayunabbas@gcuf.edu.pk	*Dean, Faculty of Islamic and Oriental Learning, Government Colllege University, Faisalabad.*

How to Cite: Samreen Akram and Dr. Humayun Abbas Shams. 2024: "The Critique of Religion and the Church in Western Rationalist Thought: Critical Perspectives and Debates". Al-*Mīthāq (Research Journal of Islamic Theology)* 3 (02): 25-40.

Article History:

Received:	**Accepted**:	**Published**:
25-07-2024	20-08-2024	08-09-2024

Copyright: **©The Authors**

Licensing: This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

Conflict of Interest: Author(s) declared no conflict of interest

Abstract & Indexing

DRJI · Advanced Sciences Index · CiteFactor · Asian Research Index · SCI · Google Scholar · اردو جرائد اشاریہ · تحقیقات تحقیقاتی اشاریہ · ADL Asian Digital Library · EuroPub

Publisher

HIRA INSTITUTE of Social Sciences Research & Development

مغربیت میں عقلیت پسندی ورڈّ مذہب اور کلیسیائی انتقادی مباحث

The Critique of Religion and the Church in Western Rationalist Thought: Critical Perspectives and Debates

1. **Samreen Akram**
Ph. D Scholar,
Department of Islamic Studies, Government Colllege University, Faisalabad.
samreenakram97@gmail.com

2. **Dr. Humayun Abbas Shams**
Dean,
Faculty of Islamic and Oriental Learning, Government Colllege University, Faisalabad.
drhumayunabbas@gcuf.edu.pk

Abstract

This article delves into the intricate and often contentious relationship between rationalism and religion in Western philosophical thought. It explores the historical tensions between rationalist ideologies grounded in reason and empirical inquiry and the foundations of religious belief, which are often based on faith, revelation, and tradition. The article examines how rationalist critiques have challenged the credibility of religious doctrines, practices, and ethics, prompting significant intellectual responses from religious scholars. Through a critical analysis of key texts and influential thinkers, this study trace's central themes that have shaped the discourse, such as the nature of reason versus faith, the boundaries between science and religion, and the ways in which both seek to explain human existence and the cosmos. The article also explores how rationalism has influenced religious ethics and moral practices, questioning whether reason can serve as a standalone guide for ethical living or if it requires the metaphysical and spiritual dimensions offered by religion. By engaging with these critical discussions, the article contributes to the broader understanding of how rationalism and religion have interacted, clashed, and, in some cases, found common ground within Western thought. The analysis highlights the enduring significance of these debates, offering insights into the philosophical and theological challenges posed by rationalism to religious traditions, and vice versa. In doing so, this work aims to enrich contemporary discourse on the compatibility, tensions, and potential synthesis between rationalist and religious worldviews in shaping human understanding and moral reasoning.

Keywords: *Rationalism, Western Philosophy, Science, Theology, Ethics.*

تمہید

مغرب میں عقلیت پرستی کا رجحان قدرے قدیم ہے جس کا بنیادی سبب کلیسیا رہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کے تناظر میں مسیحی عہدیداروں نے مذہب کے نام پر جو کام کیئے وہی اس عقلیت پرستی کی بنیاد بن گئے۔ مذہبی رویّوں میں متشددانہ کیفیات نے عقلیت پرستی کو جنم دیا جس کی بناپر روح اور مادہ پر مباحث وجود میں آئیں۔ روح اور جسم کے تعلق کو گفتگو کا عنوان بنانے کے ساتھ مختلف فکری گروہوں کا جنم بھی ہوا۔ ''عقلیت پرستی'' کا یہ دور 17ویں صدی عیسوی کے تقریباً درمیان سے شروع ہوا اور 18ویں صدی عیسوی کے وسط تک محیط رہا۔ تاہم اس کے ابتدائی اثرات 16 صدی عیسوی میں ہی نمودار ہونا شروع ہو چکے تھے۔ تاریخی اعتبار سے

مسیحیت کے مغرب پر غلبہ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں مختلف ادوار سامنے آتے ہیں جو دراصل کلیسیا کی تاریخ بھی کہلاتے ہیں اور انہی ادوار کا پیش خیمہ مغرب کا عقلیت پرستی کی جانب توجہ کا مبذول ہونا بھی تھا اور یہی کلیسیائی انتقادی مباحث کا دور بھی کہلاتا ہے۔

کلیسیا کا تعارف

عہد نامہ جدید کی اناجیل میں دو جگہ لفظ "کلیسیا" کا ذکر ہے۔ پہلا "متی 17:16، 19" اور دوسرا "متی 17:18" میں۔ ان دونوں کی پشت پر ہم آرامی لفظ کنشتہ (kenishta) دیکھتے ہیں جو ایسا لفظ ہے جسے تمام اسرائیلی جماعت کیلئے بھی استعمال کیا گیا ہے اور عبادت خانے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ لغت ہائے اُردو میں سے فیروز اللغات میں "کلیسیا" کا معنیٰ "عیسائیوں کی ایک جماعت جو مریم علیہا السلام کے بت کو پوجتی ہے" کہا گیا ہے۔[1]

علمی اُردو لغت میں "کلیسا" اور "کلیسیا" کو مترادف سمجھا گیا ہے اور معنیٰ "گرجا، عیسائیوں کی عبادت گاہ، کافروں کا بت خانہ" لکھا ہے۔[2] فرہنگ عامرہ میں بھی "کلیسا" اور "کلیسیا" کو مترادف سمجھ کر اس سے مراد "غیر اسلامی معبد، گرجا، عیسائیوں کا عبادت خانہ" کہا گیا ہے۔[3] قائد اللغات میں بھی "کلیسیا" کا معنیٰ "عیسائیوں کی ایک جماعت جو مریم علیہا السلام کے بت کو پوجتی ہے"[4] معنیٰ بتایا گیا۔ گویا اُردو کی لغت میں "کلیسیا" کا معنیٰ و مفہوم بیان کرنے میں غلطی موجود ہے۔ بیان کئے گئے معانی میں جزوی مناسبت تو مل جاتی ہے مگر کلی مناسبت نہیں۔ اس فاش غلطی کی ایک وجہ انگلش لٹریچر میں موجود معانی بھی ہیں، چونکہ انگریزی لغت میں کلیسا اور کلیسیا دونوں کے لیے چرچ (Church) کا لفظ بول دیا جاتا ہے جو یہ احتمال پیدا کر دیتا ہے کہ "کلیسا" اور "کلیسیا" ایک ہی چیز ہے مگر حقیقت اس سے یکسر مختلف ہے۔ عصری مسیحیت میں "کلیسا" اور "کلیسیا" دونوں الگ الگ مفاہیم رکھتے ہیں۔

"کلیسیا" یسوع مسیح پر ایمان لانے والی جماعت کو کہا جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ ایک یونانی لفظ "اکلیسیا (ekklesia)" سے ماخوذ ہے جس کا لفظی معنیٰ "مجلس" ہے۔ لیکن اس معنوی مناسبت کے اعتبار سے "یسوع مسیح (عیسیٰ علیہ السلام) کے شاگردوں کے نئے اجتماع یا جماعت کو بیان کرنے کے لیے" کلیسیا لفظ کو اختیار کیا گیا۔[5] علامہ غلام رسول قاسمی نے کلیسیا کے مفہوم کو "پادریوں کی پنچایت" کی صورت میں واضح کیا ہے۔[6] تاہم عصر حاضر میں یہ لفظ اصطلاحاً "ایمانداروں کی مقامی جماعتوں" کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔[7] الغرض مسیحیت میں کلیسا اور کلیسیا مختلف مفاہیم اور الگ الگ اصطلاح کا درجہ رکھتے ہیں۔ "کلیسا" سے مراد وہ عمارت ہے جس میں مسیحی اقوام عام طور پر اجتماع کی صورت میں اتوار کے دن عبادت کے لیے جمع ہوتی ہیں۔ جسے یہاں عرفِ عام میں "گرجا" کہا جاتا ہے۔ جبکہ "کلیسیا" کا لفظ مسیحی جماعت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

"رسولی" اور "مابعد رسولی" دور

قبل از ازمنہ وسطیٰ "رسولی دور (Apostolic Age)" اور "مابعد رسولی دور (Post-Apostolic Age)" تاریخ میں ظلم و ستم کی ایک حیرت انگیز اور عجیب سی داستان پیش کرتے ہیں مگر مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی زوال کے بعد ایسا عروج آیا کہ مسیحیت کو ریاستی مذہب کا درجہ مل گیا۔ گیلریس (Galerius) نے اپریل 311ء میں حکم نامہ جاری کیا اور مسیحی رسومات کی ادائیگی کی عام اجازت دے دی۔ 313ء میں قسطنطین (Constantine the Great) نے مسیحیت کو ریاستی مذہب قرار دے دیا اور ساری ریاست میں اسی مذہب کے نفاذ کی ہدایات دی گئیں۔ اس حیثیت سے پہلا مسیحی بادشاہ قسطنطین کہلایا۔ 391ء تھیوڈوسس اول (Theodosius I) کی حکومت میں مسیحیت پوری رومی سلطنت کا ریاستی مذہب قرار دیا جا چکا تھا اور اس کے بعد کلیسیائی انتقادی مباحث کا دور بھی شروع ہوا جس میں "کلیسیائی مجلسیں" اہم تاریخی پہلو ہے۔ ان مجالس کا فائدہ تو رہا لیکن اسی تنقید کے سبب

مسیحیوں میں افتراق بڑھا اور پوپ لیو اعظم(Pope Leo the Great) کی صدارت میں کالسدون(Chalcedon) کی کونسل جو 8 اکتوبر تا یکم نومبر 451ء منعقد ہوئی، کونسل کے فیصلے کی وجہ سے مغرب میں روم اور مشرق میں قسطنطنیہ کے بیچ شدید اختلافات پیدا ہوئے اور نتیجتاً بعد میں کلیسیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔[8]

ازمنہ وسطیٰ

مغرب کی تاریخ میں یہ دور پانچویں صدی سے پندرہویں صدی عیسوی یعنی ہزار سال پر مشتمل ہے جس میں اگر میسحیت کی تاریخ پر غور کیا جائے تو مذہبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و اقتصادی گویا بہت انواع کی تبدیلیاں مسیحی عالم کے تناظر میں سامنے آتی ہیں۔ اس سے قبل میسحیت نے دنیا میں اپنا ایک مقام قائم کر لیا تھا اور بہت سے علاقے اپنی تحویل میں لے لئے تھے۔ اپنے مذہبی نظام کو قائم رکھنے کے لیے "کلیسیا" کی بنیادیں مضبوط کر چکے تھے، جس کے اثرات مغربی دنیا کے جدید ادوار تک نقش رہے۔

ابتدائی ازمنہ وسطیٰ(476ء تا 800ء) میں مغرب رومی سلطنت میں جدید اصلاحات کا نفاذ ہوا اور ساتویں صدی میں اسلام کی آمد سے مشرقی(یونانی) اور مغربی(لاطینی) کلیسیا الگ الگ رجحانات کی حامی بن گئیں۔ رومی کلیسیائی رہنماؤں نے بازنطینی مہذب حکمرانوں کے رجحانات کی بجائے باربیرئن(Barbarian) رجحانات کو قبول کیا۔ اس دور میں رومی سلطنت میں پوپ کے عہدہ نے ترقی کی اور پوپ کے اختیارت میں بے حد اضافہ ہوا یہاں تک کہ پوپ لیو سوم(Pope Leo III) نے کلیسیا کو محفوظ رکھنے کے لیے شارلمین(Charlemagne) کو 800ء میں رومی سلطنت کا حکمران بنا دیا گیا اور ابتدائی ازمنہ وسطیٰ میں ہی پاپائیت اور پوپ کی پیشوائیت کا ظہور ہوا۔

پاپائیت اور پیشوائیت

روم(Rome) رومی بادشاہت کا دارالحکومت ہونے کی حیثیت سے بڑا شہر اور حکمران طبقے سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے رومی خاندانوں کی جائے رہائش تھا۔ روم کا بشپ اپنے آپ کو سینٹ پیٹر(Saint Peter) کا جانشین سمجھتا اور اس کے تمام اعزاز واحترام کا اپنے آپ کو حقدار قرار دیتا تھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں روم کے مغربی کلیسیا میں مسیحی بشپ پوپ بن گیا اور حکمران اس کے ماتحت ہو گئے، چرچ کا اقتدار پورے یورپ پر چھا گیا اور یونانی زبان کو چھوڑ کر لاطینی زبان اختیار کی گئی۔ اس دور کے اہم واقعات میں غیر عیسائیوں پر مظالم شامل ہیں مزید یہ کہ غیر مسیحیوں کی جائیدار ضبط کر لی گئی ان کو سزائیں دی گئی جن میں مصلوبیت، زندہ جلانا، جانوروں کے آگے ڈالنا، جلاوطنی شامل ہے۔ میسحیت کی جڑوں کی مضبوطی کیلئے اور غیر مسیحیوں کو مسیحی بنانے کے لیے کئی علامات اختیار کی گئی یعنی شہدا کی یادگاریں، معجزوں کے تذکرے، مقدسین کے تبرکات وغیرہ۔ ان علامات کا مقصد لوگوں میں عقیدت کو فروغ دینا کہ یہ مسیحی مقدسین خدا کے کتنے قریب ہیں۔ پوپ چرچ کا روحانی سربراہ تھا۔ عقیدہ اور ایمان کی اتھارٹی، حکمران اور عوام اس کی نگرانی میں تھے۔ چرچ کا کیلنڈر نافذ کیا گیا شہروں کا نقشہ بدل دیا گیا، عوام کے تفریحی مقامات کی جگہ خانقاہیں، مقبرے، زیارت گاہیں اور چرچ بنائے گئے۔ روم کے بشپ لیو اول(Leo I) دور(440ء-461ء) کو اکثر پہلا پوپ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے شہنشاہ کی مدد سے پاپائی برتری کی حیثیت کو عملاً قائم کیا۔ مزید برآں پوپ گلاسیتس(Pope Gelasius I) نے پاپائی نظریہ کو مزید بڑھایا اور زور دیا کہ شہنشاہ کلیسیا کا محافظ ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پوپ کی فرمابرداری کرے۔ اس پاپائی نظام کے بارے میں "J. A. Wylie" نے یوں لکھا ہے:

The Council of Chalcedon established the superiority of the Roman see

on this very ground. "The fathers," say they, justly conferred the dignity on the throne of the presbyter of Rome, because that was the imperial city.[9]

کالسدون (خلقیدون) کی کونسل نے روم کے کلیسیائی دائرہ اختیار کو سند قبولیت عطا کی کیونکہ کونسل میں شریک پادریوں نے روم کے اسقف کو اعلیٰ وارفع قرار دیا تھا اور اس عظمت کی وجہ اسقف کا روم کا شاہی شہر ہونا تھا۔

پوپ گریگوری اعظم (590ء-604ء) جسے (Pope Gregory I) اور (Saint Gregory the Great) بھی کہا جاتا ہے، کے ذریعے سے پوپ کا اختیار ایک حقیقت بن گیا۔ گریگوری اول کی پاپائیت تاریخ کلیسیا میں ایک تاریخ ساز واقعہ ثابت ہوئی وہ دنیائے قرون وسطیٰ کی علامت ہے۔ اپنی پاپائیت کے دوران گریگوری نے پوری مسیحیت کو دائرہ اختیار قرار دیا اور اس پر عمل کیا لہٰذا گریگوری کو گریگوری اعظم کہا جانے لگا۔ اس کا شمار جیروم (345ء-419ء)، امبروز (339ء-397ء) اور آگسٹین (354ء-430ء) کے ساتھ ہوتا ہے جو مغربی کلیسیا کے اہم افراد تصور کیے جاتے ہیں۔ گریگوری کا اہم کارنامہ تھیا کریسی (خدائی حکومت) قائم کرنے کی کوشش تھی جس میں پوپ کو خدا کا نائب یا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے دنیاوی وروحانی اختیار حاصل تھے۔ گریگوری نے وضاحت کی کہ کس طرح کلیسیائی پاسبانی اور اختیار، دنیوی یا سیاسی اختیار سے بڑھ کر ہے۔ گریگوری (Gregory) کا کہنا تھا:

روما تمام دنیا کا دارالسلطنت ہے اور مقدس پطرس خلیفۃ المسیح اس کا بانی ہے۔ کلیسیائے روم صحیح تعلیم وعقائد پر قائم اور بدعت سے مبرا ہے۔ روما دارالامان اور اُم کلیسیا ہے۔ دنیوی شاہ سے (خلیفۃ المسیح) پاپائے روم اعلیٰ وبالا ہے۔ کلیسیا روما کو صرف خدا نے قائم کیا ہے۔ صرف پاپائے روم حقیقی طور پر عالمگیر کہلاتا ہے۔ تمام شہزادے پوپ کی قدم بوسی کریں گے۔ کلیسیائے روما نے کبھی غلطی نہیں کی اور تا ابد کبھی غلطی نہیں کرے گی۔ صرف اسکے پاس بشپوں کو معزول اور بحال کرنے کا اختیار ہے۔ اس کے فرمان کو کوئی شخص منسوخ نہیں کر سکتا لیکن وہ کسی بھی شخص کا فرمان منسوخ کر سکتا ہے۔[10]

مختصراً گریگوری (Gregory) نے رومی کلیسیا کو مستحکم کر دیا، پاپائیت کے نظام اور اختیارات کو قوت ملی، یورپ کے دیگر خطوں میں تبلیغ مسیحیت کی مذہبی فتح کے نتیجے میں پورے یورپ نے مسیحیت اختیار کرلی۔ مسیحیت کو فروغ ملا حتی کہ سیاسی معاملات میں بھی کسی قسم کی پیش رفت پوپ کی اجازت کے بغیر تصور نہیں کی جاتی تھی۔ گریگوی نے پاپائی نظام کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا، پوپ کی قوت میں اس اضافے کا سبب دو وجوہات تھیں:

- مسیحیت کا پھیلنا۔
- لوگوں کا مسیحیت کو قبول کرنا اور پوپ کو بادشاہوں کی حمایت حاصل ہونا۔

دوسری طرف آٹھویں صدی عیسوی میں فرانسیسی قبائل سے ایک خاندان جو یورپ کے وسط اور مغرب کے بڑے حصے پر تسلط قائم کر چکا تھا۔ بادشاہ نے اپنے بیٹے شاریمان کو اپنی حکومت اور مغربی رومی سلطنت کے وارث اور کلیسیا کے سرپرست کی حیثیت سے مقدس رومی سلطنت ہونے کا دعویدار بنادیا۔ تخت فرانسیسی اور مسیحی کلیسیا کے اس جوڑ کا نتیجہ روم اور اس کے نواح میں پوپ کی براہ راست حکومت کے لیے ایک ریاست کی بنیاد بنا۔ اب پوپ بطور مسیحیوں کے روحانی پیشوا روم کے گردونواح میں بھی ایک دنیوی ریاست کا سربراہ بن گیا۔ پوپ کو لامحدود اختیارات حاصل ہوئے۔ دنیاوی اور دینی طاقتوں کا منبع قرار دیا گیا۔ حتی کہ قانون سازی کے اختیارات بھی اس کے ہاتھ میں تھے۔ پوپ کی نافرمانی گناہ قرار دی گئی۔ پوپ کا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا جس کی وجہ سے تمام بادشاہوں کو پوپ کی حمایت حاصل تھی۔

پوپ کی زبردست طاقت کا مظاہرہ آٹھویں صدی کے اختتام میں اس وقت ہوا جب روم کے شہنشاہ شارلمین کی پوپ نے اپنے ہاتھ سے تاج پوشی کی۔ بعد اس کے روما کا نام "مقدس سلطنت روما" رکھ دیا گیا۔[11] اس وقت سے لے کر سولھویں صدی عیسوی تک یورپ کے بادشاہوں کا کنٹرول پوپ کے ہاتھ رہا۔ پوپ بادشاہت کے اہل اور نااہل ہونے کا فیصلہ کرنا۔ شارلمین کی وفات کے بعد روما میں انتشار پیدا ہوا۔ حکمرانوں کی خود مختاری شروع ہوگئی تو تمام جاگیر داروں، فرمانرواؤں اور سرداروں کی مرضی سے طے کیا گیا کہ آئندہ ہر بادشاہ کی تاج پوشی پوپ کرے گا یا اس کے منتخب کردہ نمائندگان۔ لہٰذا پوپ کی ذات میں روحانی تاجداری کے ساتھ دنیاوی تاجداری بھی پیدا ہوگئی۔ پوپ نہ صرف شہنشاہ تھا بلکہ اس کی ظاہری شان و شوکت کا اندازہ بھی یوں لگایا جاسکتا ہے کہ پوپ کو لاکھوں جواہرات لگا تاج پہنایا جاتا تھا اور اس کی خاص جاگیر تھی۔ اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تیرھویں صدی میں پوپ کی جاگیر تیرا ہزار مربع میل تھی۔ دولت نے کلیسیا کو اس وقت اہم ادارہ بنادیا تھا ایک طرف یورپ کے بادشاہوں کے تاج پوپ کے ایک ہاتھ میں اور دوسری طرف رعایا کی مذہبی وسیاسی قوت کے ساتھ دل و دماغ پر فیصلوں کی کمند پوپ کے دوسرے ہاتھ میں تھی۔[12]

مغرب میں ازمنہ وسطیٰ (800ء تا 1499ء) وہ دور ہے جب شارلامین (Charlemagne) کو رومن ایمپائر کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ کلیسیائی اختلافات کی بنا پر رومن کیتھولک اور گریک آتھوڈوکس کلیسیا جدا جدا ہوگئے۔ قسطنطنیہ کو شکست ہوئی اور مسلمانوں کے زیر اثر چلا گیا۔ نیز پاپائیت کے زیر اثر انجیل کی منادی جو کہ صرف پادریوں تک محدود تھی اور مذہبی کتب کو عام مسیحیوں کو پاس رکھنے پر پابندی تھی۔ قرون وسطی میں مسیحیوں کو کلیسیا کی جانب سے یہ اجازت نہ تھی کہ ہو بائبل کو پڑھیں یا اپنے پاس رکھیں۔ رومن کیتھولک اور گریک آتھوڈوکس کلیسیا دونوں میں یہ نظام رائج تھا۔ بائبل کو پڑھنے کے لیے صرف پادری صاحبان مقرر تھے جو خود عام مسیحیوں کو بائبل پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر رچرڈ ڈالینجر کلیسیا کے اس طرزِ عمل کو یوں لکھا ہے:

> خدا کا کلام رومن کاتھولک چرچ تک مقید ہو کر رہ گیا تھا، ان کے منبر کو بائبل کی اصلی زبانوں، عبرانی، یونانی اور لاطینی میں جکڑ رکھا تھا تا کہ عام آدمی نہ جان پائے، نہ سمجھ سکے۔ مزید یہ کہ اس فساد کے ارتکاب میں نہ صرف مغربی رومن کاتھوک چرچ تھا بلکہ مشرقی بیزنٹائن آتھوڈوکس چرچ بھی اس میں شامل تھا۔[13]

سلطنت میں کلیسیا کو مرکزی حیثیت ملنے کے بعد کلیسیائی رہنماؤں نے صلیبی جنگوں (Crusades) کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا جس کا بنیادی مقصد مسیحیوں اور ان کی مقدس زمینوں کو اندرونی و بیرونی خطرات سے بچانا تھا۔ صلیبی جنگیں دراصل مذہبی جنگیں تھیں جن کا بنیادی سبب یروشلم جو کہ انبیاء سابقین کا مقام تھا، اسے سلجوقی ترکوں سے آزاد کرانا تھا۔[14] سلجوقی ترکوں نے مسیحیوں کو مقدس مقامات پر آنے سے روک دیا جو کلیسیا کے لیے قابل برداشت نہ تھا اسی وجہ سے پوپ اربن دوم (Pope Urdan II) نے 1095ء میں صلیبی جنگ کی منادی کی جو 170 برس تک متواتر جاری رہی۔[15] مسیحی مؤرخ پادری خورشید عالم لکھتے ہیں:

> صلیبی معرکہ کی منادی پوپ اربن دوم نے 1095ء میں کونسل کلیر مونٹ میں کی جس میں فرانسیسی بشپ حاضر تھے۔ دورانِ تقریر میں پوپ نے کلیسیا و اُمراپراخوت، حفاظت مقدس شہر (یروشلیم) اور تبرکات کی حُرمت کا بوجھ ڈالا اور کہا کہ کوئی چیز تمہیں اس انعام سے محروم نہ رکھے۔ جان دینے تک وفادار رہو تو تم کو زندگی کا تاج ملیگا، سو عوام فتح، لوٹ اور ابدی انعام کے جوش میں نعرے لگانے لگے کہ "ڈیوس وُولٹ (Deusvult)" یعنی خدا چاہتا ہے۔ سو مجاہدانِ صلیب رضاکارانہ سفید صلیب کا عہدی نشان لئے معصوم بچوں کے جتھوں کے ہمراہ غیر منظم طور پر چل دئے۔ پوپ نے فرانسیسی بشپ کا تعین کیا کہ وہ ان کو منظم کر کے لے جائیں لیکن وہ بلا

انتظام و ضبط بے یار و مدد گار چلے گئے۔ بُھوک، پیاس اور تھکان کی وجہ سے ہنگری یا ایشیاء کوچک میں ختم ہو گئے۔ ان کے ولولہ انگریز جوشِ شہادت کو دیکھ کر بشپوں، مقدسوں اور راہبوں نے صلیبی مہم کی راستی اور اہمیت پر تقاریر کیں۔[16]

صلیبی جنگوں کا یہ سلسلہ 1096ء تا 1272ء جاری رہا اور اس میں درمیان میں آنے والے ہر گروہ کا نقصان ہوا۔ وقت کے مقرر ہونے والے پوپ ان مذہبی جنگوں میں مستقل شامل رہے۔ ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ کے دوران کئی جنگیں اور کچھ تو کئی سال تک لڑی جاتی رہیں۔ اس دوران پوپ کے اختیار کو بھی نقصان پہنچا۔ بادشاہوں اور پوپ کے اختیارات میں تنازعات بڑھے۔ مزید براں مسیحیوں میں خوف وہراس پھیلنا شروع ہوا یوں وقت کے ساتھ بادشاہ، نواب اور پوپ نے اپنی عوام پر مختلف بدعتوں کے سبب شکنجہ کسا جس کے باعث آزاد خیالی اور مذہب بیزاری کی کیفیات پیدا ہونے لگیں۔ ازمنہ وسطیٰ کے اس دور کو مصنفین نے "ظلماتی دور" بھی کہا ہے۔ اس دور کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

> یہ لوگ کہتے ہیں: اس دور میں باشاہوں، نوابوں اور پادریوں نے مل کر عوام کو اپنے شکنجے میں کس رکھا، پادری علم کے ٹھیکیدار بن بیٹھے اور عوام کو علم سے محروم کر دیا تھا۔ دینی معاملات میں پوپ نے سارا اختیار سنبھال لیا تھا جس چیز کو سفید کہہ دیا، وہ سفید جس کو سیاہ کہہ دیا، وہ سیاہ۔ عوام کو فکر کی آزادی حاصل نہ تھی بلکہ علم کی پرچھائیاں تک عوام پر نہ پڑنے پاتی تھیں۔ کلیسا سائنس کا خاص مخالف تھا جہاں پر بھی کسی نے کوئی نیا خیال پیش کیا اسے فوری سزا دی گئی۔ چنانچہ لوگ تو سوچنے سے بھی ڈرتے تھے اور ذہنوں کو زنگ لگ رہا تھا۔[17]

الغرض علم و حکمت کے روبزوال ہونے کے سبب ایسے افکار وآرا کو فروغ ملا جو "جدیدت" اور "عقلیت پرستی" کی بنیاد بنے۔ جیسا کہ ہر علم کے دو پہلو ہوتے ہیں، ظاہری و باطنی، تو کلیسیا کے اس ردِّ علم سے مذہبی تعلیمات کا باطنی پہلو مثلِ عنقا ہو گیا تھا اور وہی علم باقی تھا جو ظاہری الفاظ تھے مگر اس فرسودہ حالت کے باعث مذہب کے ظاہری علم صرف رومن کیتھولک لوگوں کے پاس رہ گیا تھا اور یہ بھی روبزوال ہوتا گیا۔[18]

افتراقِ عظیم (The Great Schism)

مسیحیت کی تاریخ میں سیاسی اور علمی انحطاط وزوال سے کلیسیا فرقوں میں بٹ گئی۔ کلیسیا اور ریاست کے ملاپ سے کلیسیا کی قیادت کے زیادہ سے زیادہ مادہ پرست اور کم سے کم روحانی بن جانے کی وجہ سے بدعنوانی زور پکڑنے لگی۔ مغربی اور مشرقی کلیسیاؤں کے درمیان مقابلہ بازی سے ایک ناگزیر تفرقہ کی نشاندہی ہوئی اور 1054ء میں وہ کلیسیا جو عالمگیری کا دعویٰ کرتی تھی، باضابطہ طور پر دو کلیسیاؤں میں بٹ گئی۔ مشرق و مغرب کے کلیسیاؤں کے مابین اختلاف کے باعث مشرقی کلیسیا ہمیشہ کے لیے مغربی کلیسیا (رومن کیتھولک چرچ) سے الگ ہوگئی اور اپنا نام دی ہولی آرتھوڈکس چرچ رکھا۔ تاریخ میں اس نفاق کو "افتراقِ عظیم (The Great Schism)" اور "East-West Schism" کہا جاتا ہے۔ اس افتراق کی وجوہات وہ اختلافات تھے جو صدیوں سے سلگ رہے تھے۔ افتراقِ عظیم کے پس پردہ کلیسیاؤں کے مختلف نوعیت کے مذہبی وسیاسی اختلافات تھے۔ قسطنطنیہ کی کلیسا اور روم کی کلیسا میں پہلا سیاسی اختلاف اس وقت ظاہر ہوا جب تھیوڈوسیئس اول (Theodosious I) کا 395ء میں انتقال ہوا اور اس کا ایک بیٹا آرکیڈیس (Arcadius) مشرقی حصہ (Eastern Roman Empire) کا فرمان روا رہا اور دوسرا بیٹا ہونوریس (Honorius) مغربی حصہ (Western Roman Empire) کا فرمان روا رہا۔ اس طرح مشرق و مغرب کے بشپوں میں یہ نہ صرف جغرافیائی لحاظ

سے بلکہ سیاسی وفاداریوں کے اعتبار سے بھی تقسیم ہوئی۔ مذہبی تناظر میں 451ء میں منعقد کی گئی کالسدون (خلقیدون) کی کونسل افتراقِ عظیم کا بنیادی سبب تھی۔ بعد ازاں سیاسی حالات اور بعد کی کونسلوں میں یہ نظریاتی تنازعات بڑھتے چلے گئے جیسا کہ کلیسیائی اصطلاحات کے ارتقاء سے واضح ہے۔ چنانچہ انہیں اختلافات کے تناظر میں قسطنطنیہ کونسل چہارم (869ء تا 870ء) کا انعقاد اس مقصد کے لیے کیا گیا کہ قسطنطنیہ کے بطریق کو قانونی شکل دی جائے اور کلیسیاؤں کے تعلقات کو معمول پر لایا جائے لیکن اس کونسل میں استنبول (قسطنطنیہ) کے بشپ کو فتویٰ دے کر ختم کر دیا۔ اس کے بعد ڈیڑھ سو سال تک کوئی کلیسیائی کونسل منعقد نہ ہو سکی اور بالآخر ان اختلافات کا انجام 1054ء میں "افتراقِ عظیم" ہوا۔

پروٹسٹنٹ اور تحریک اصلاحِ کلیسیا

مذہبی اور سیاسی انحطاط، قیصر اور پوپ کے جھگڑوں، بائبل کی تعلیم پر پابندی اور عوام کی تباہ کن حالت کے تناظر میں سولہویں صدی عیسوی میں کلیسیا میں "تحریک اصلاح" کا آغاز ہوا جسے "The Reformation"، "Protestant Reformation" اور "European Reformation" کے نام سے جانا گیا ہے۔ اس تحریک کا مرکزی قائد مارٹن لوتھر (Martin Luther) (1483ء-1546ء) تھا جو جرمنی کی ریاست "Saxony-Anhalt" میں پیدا ہوا۔ ابتداءً قانون کی تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں الٰہیات کا شعبہ اختیار کر لیا۔ بائبل کے مطالعہ سے اس کے اندر مروجہ کلیسیائی نظام کی اصلاح کے جذبات ابھرے۔ تعلیمات بائبل کے تناظر میں اس نے پاپائے روم اور کلیسیا میں جاری غیر مناسب رویوں کی مخالف کرتے ہوئے 31 اکتوبر 1517ء کو 95 نکات پیش کئے جو کلیسیا میں پروٹسٹنٹ کے ظہور کا باعث ہوئے۔ ان غیر مناسب رویوں میں شخصی آزادی نہ ہونا، بائبل کی تعلیم عام نہ ہونا، مسیحی شخصیات کے مجسموں پر بے جا چڑھاوے چڑھانا اور مذہبی رہنماؤں کا گناہوں کے معافی ناموں کی فروختگی کرنا وغیرہ بھی شامل تھا۔ پادری خورشید عالم لکھتے ہیں:

> جان ٹِٹزل کی خبر آئی کہ وہ آرہا ہے تا کہ وہ مغفرت ناموں کو فروخت کرے۔ جب وہ علاقہ سیکسنی میں وارد ہوا تو ٹِٹزل چِلایا، مجھ سے مہر شدہ سرٹیفکیٹ خرید لو، تمہارے گناہ معاف ہوں گے بلکہ وہ بھی گناہ جو ابھی کرنے والے ہو۔ ہر خاص گناہ کے لیے خاص قیمت مقرر ہے۔ زنا کے لیے چھ ڈِکٹ، قتل کے لیے آٹھ ڈِکٹ اور دروغ بیانی کے لیے لو۔[19]

چنانچہ انہی عجیب بدعات کی وجہ سے جو تحریک ذہنوں میں مسلسل جاری تھی اسے وجود ملا اور مارٹن لوتھر نے کلیسیا کے سامنے اپنے 95 نکات رکھے جو حسب ذیل تھے:

1. ہمارے رب اور مالک یسوع مسیح، کہنے لگے! "توبہ کرو، وغیرہ" کا مقصد ہے کہ اس نے مومنوں کی پوری زندگی کو توبہ کے لیے بلایا۔
2. لفظ جو اعتراف کے ساکرامنٹ کے لیے استعمال ہوا ہے وہ اپنا مطلب واضح طور پر بیان نہیں کرتا جسے پادری لوگ اعتراف اور اطمینان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔
3. یہاں تک کہ اس کا مطلب کسی کے دل کو توبہ تک محدود نہیں ہے، اس طرح کی توبہ تب تک بیکار ہے جب تک وہ ظاہر نشان نہ پیدا کرے۔
4. جب تک خود سے نفرت جاری رہتی ہے تب تک شرمندگی جاری رہتی ہے یعنی جنت میں داخل ہونے تک۔

5. پوپ کو اپنے ذاتی اختیار یا کینن کے قانون کے مطابق سزا دینے کا اختیار نہیں ہے۔
6. پوپ کو گناہ معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے وہ صرف اعلان کر سکتا ہے کہ خدا نے گناہ معاف کیا ہے۔ پوپ صرف وہ معاف کر سکتا ہے جو اس کی اپنی ذات تک محدود ہے، دیگر صورت میں گناہ قائم رہتا ہے۔
7. خدا کسی کا گناہ اسوقت تک معاف نہیں کرتا جب تک وہ اس کے نائب کے سامنے عاجزی کے ساتھ معافی نہ مانگے۔
8. کینن کے قوانین صرف زندہ لوگوں پر نافذ ہوتے ہیں اور بلکل اسی طرح مردہ لوگوں پر نافذ نہیں کیے جاسکتے۔
9. رُوح القدس پوپ میں ہو کر کام کرتا ہے مگر موت کے بعد اس کے تمام احکام ختم ہو جاتے ہیں۔
10. لاعلمی کہ وجہ سے یہ عمل بلکل غلط ہے کہ مرنے والوں پر کینن قوانین کے تحت جرمانہ نافذ کیا جائے جب تک مرنے والا برزخ میں ہے۔
11. کینن قوانین کو برزخ کی سزا میں تبدیل کر دیا گیا۔ لگتا ہے جب یہ کانٹے بوئے گئے تب بشپ سو رہے تھے۔
12. حقیقی توبہ اور افسوس کی آزمائش کے طور پر عام دنوں میں کینن قوانین کو نافذ کیا جاتا ہے۔
13. مرنے والے موت کے وقت کینن کی تمام سزاؤں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔
14. مردہ شخص میں غیر معمولی روحانی صحت یا محبت لازمی طور پر اس کے خوف سے لاتا ہے اور کم از کم یہ پیار ہے جس سے خوف آتا ہے۔
15. یہ خوف اور افسوس دوسری چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ یہ خوف اور افسوس برزخ کی سزا کے لیے کافی ہے۔
16. دوزخ، برزخ اور جنت میں وہی فرق نظر آتا ہے جو فرق غیر یقینی، ناامیدی اور یقین میں ہے۔
17. جب روحوں میں خوف کی کمی ہوتی ہے تو برزخ کے لیے محبت بڑھ جاتی ہے۔
18. ایسا نہیں لگتا کہ دلائل یا صحائف کے ذریعہ ثابت ہو کہ روحیں فضل حاصل کرنے کا معیار رکھتی ہیں یا نہیں۔
19. اور نہ ہی اس سے نجات کی یقین دہانی ہوتی ہے جیسے ہم یقین رکھتے ہیں۔
20. پوپ جو کہتا ہے کہ تمام سزائیں معاف ہو گئیں تو ایسا ثابت نہیں ہوتا مگر صرف وہ سزائیں جو اس نے خود دی ہوں۔
21. لہٰذا انفرادی طور پر ان مبلغین کو غلط قرار دیا جاسکتا ہے، جو پوپ کی غفلت کیوجہ سے انسانوں کی غلطیاں معاف کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔
22. جو سزائیں زندگی میں نافذ کی جاتی ہیں وہ سزائیں روحوں کی برزخ میں معاف نہیں کر جاسکتیں۔
23. اگر کسی کی تمام سزائیں معاف کی جاسکتی ہیں تو وہ اسی صورت میں ہے کہ وہ بہت ہی کامل شخص ہو، ایسا بہت کم ہے۔
24. لازمی طور پر بہت سے لوگ اس دھوکہ میں ہیں بڑے وعدوں کے وجہ سے ان کو سزاؤں سے آرام حاصل ہو گا۔
25. جو اختیارات پوپ استعمال کرتا ہے برزخ کے بارے میں وہی اختیار بشپ اور پادری بھی اس طرح استعمال کرتے ہیں۔
26. جب پوپ کسی کی سزا کو اس کے اعمال کے مطابق شفاعت کے طور پر معاف کرتا ہے تو اچھا کرتا ہے۔ مگر چابیوں کے اختیار سے کرنا ٹھیک نہیں ہے۔
27. ایسی تعلیم دینے کے لیے کوئی الٰہی اختیار موجود نہیں کہ پیسوں کے بدلے دوزخ میں فوری گناہ معاف ہو سکتے ہیں اور روح برزخ میں سے فوری طور پر اُڑ جاتی ہے۔

28. یہ ضرور ہے پیسے کی وجہ سے لالچ میں اضافہ ہوتا ہے مگر جب چرچ شفاعت کرتا ہے تو باقی خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔
29. وہ جانتا ہے کہ کون سے روحیں برزخ میں معافی کی خواہش رکھتی ہیں جیسے سینٹ پاسکل اور سینٹ سرورنس چاہتے تھے۔
30. اپنی معافی کی حقیقت سے کوئی بھی واقف نہیں ہے، بہت ہی تھوڑے ہیں جو اجتماعی معافی حاصل کر رہے ہیں۔
31. توبہ کا مخلص طلبگار کوئی ہی کبھی نظر آتا ہے۔ یہ وہ ہے جو حقیقی آرام حاصل کر سکتا ہے مگر ایسا کوئی کم ہی ملتا ہے۔
32. جو یہ خیال کرتے ہیں کہ خط حاصل کر کے ان کی معافی ہو گئی ہے اپنے استادوں کے ساتھ ابدی عذاب کے راستے پر ہیں۔
33. ہمیں ایسا کہنے والوں سے خود کو بچانے کی ضرورت ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ پوپ کی وجہ سے ان کو معافی حاصل ہو جائے گی۔
34. اسی طرح کی معافی عام طور پر توبہ اور اعتراف کے ساکرامنٹ کے ساتھ جڑی ہے جو آدمیوں کی طرف سے بنایا گیا ہے۔
35. یہ تعلیم کلام کے مطابق نہیں ہے کہ روحوں کے لیے معافی خریدی جا سکتی ہے اور خود اپنے گناہوں کے لیے توبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
36. ایک سچا مسیحی جو بھی سچی توبہ کرتا ہے وہ معافی حاصل کرتا ہے اور اسے کسی سے خط لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔
37. کوئی بھی مسیحی، زندہ یا مردہ، جو چرچ کی خدمات میں حصہ لیتا ہے مسیح کی خاطر اس کو یہ خدمت مسیح کی طرف سے ملتی ہے اور کسی سے خط کی ضرورت نہیں ہے۔
38. لیکن پوپ کی طرف سے دی جانی والی معافی نہیں ہے جیسا پہلے بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس معافی کو الٰہی معافی کہتے ہیں۔
39. قابل ترین پادریوں کے لیے بھی بہت مشکل ہے کہ وہ پوپ کی عظمت بھی بیان کریں اور سچ بھی بول سکیں۔
40. توبہ کا طلب گار تلاش میں رہتا ہے اور سزا سے محبت کرتا ہے۔ جب کہ امیر لوگ سزا سے نفرت کرتے ہیں اور یہ ہی لوگوں کو سیکھاتے ہیں۔
41. پوپ کی غفلت کے بارے لوگوں کو آگاہ کرنا چاہیئے تاکہ یہ نہ ہو کہ لوگ اچھی باتوں کی بجائے ایسی باتوں سے محبت رکھیں۔
42. مسیحی لوگوں کو یہ سکھایا جانا چاہیئے کہ وہ معافی نہ خریدیں بلکہ خدا کے رحم پر بھروسہ کریں۔
43. مسیحی لوگوں کو یہ سکھانا چاہیئے کہ جب وہ غریب کو دیتے ہیں اور ضرورت مند کو قرض دیتے ہیں تو اچھا کام کرتے ہیں اور یہ معافی خریدنے سے اچھا ہے۔
44. محبت کے کاموں کی وجہ سے محبت بڑھتی ہے اور آدمی مزید اچھا آدمی بن جاتا ہے جبکہ خریدی ہوئی معافی سے انسان اچھا نہیں بنتا بلکہ وہ سزا سے بھاگتا ہے۔
45. مسیحی لوگوں کو سیکھایا جانا چاہیئے کہ جو کوئی کسی غریب کو دیکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے وہ بھی معافی خریدنے کے لیے پیسہ دیتا ہے اور پوپ کی طرف سے معافی نہیں حاصل کرتا بلکہ خدا کے عذاب کو بڑھاتا ہے۔
46. مسیحی لوگوں کو سیکھایا جانا چاہئے جو کچھ اُن کی ضرورت سے زیادہ ان کے پاس ہے وہ انہی کے گھر کے ہی لیے ہے نا کہ وہ معافی خریدنے کے لیے وہ سب خرچ کریں۔
47. مسیحی لوگوں کو یہ سیکھایا جانا چاہیئے جو معافی وہ خریدتے ہیں وہ رضاکارانہ ہے۔ ان پر ذمہ داری نہیں کہ وہ ایسا لازمی کریں۔
48. مسیحی لوگوں کو یہ سکھایا جانا چاہئے جو کچھ وہ پوپ پر خرچ کرتے وہ ایسا کرنے کے لیے بار بار تیار رہیں کیونکہ پوپ کی ضرورتوں میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

49. مسیحی لوگوں کو یہ سیکھایا جانا چاہئے جو لوگ پوپ سے کچھ حاصل کرتے ہیں وہ ایسی صورت میں ہی فائدہ مند ہے کہ اس پر انحصار نہ کریں مگر یہ زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے اگر اس کے ذریعے آپ خدا کے خوف کو بھول جائیں۔
50. مسیحی لوگوں کو یہ سیکھایا جانا چاہئے کہ اگر وہ پادریوں کے تبلیغ کے طریقے کے بارے میں جانتا ہے اسے چاہئے کہ وہ اس کی جگہ یہ کرے کہ سینٹ پیٹر چرچ کو جلا کر رکھ کر ڈالے اور اسے اس کی بھیڑوں کی کھال، گوشت اور ہڈیوں کی مدد سے دوبارہ تعمیر کرے۔
51. مسیحی لوگوں کو یہ سیکھایا جانا چاہئے کہ اگر پوپ ایسا ہی کرنا چاہتا ہے تو وہ سینٹ پیٹر چرچ کو بیچ کر تمام پیسہ ان تاجروں کو دے دے جو معافی نامہ فروخت کر کے پیسہ اکھٹا کرتے ہیں۔
52. خطوں کے وسیلے معافی حاصل کرنے پر بھروسہ رکھنا بالکل بیکار ہے چاہے وہ پوپ یا کسی اور کی طرف سے دیا گیا ہو۔
53. ایسا کرنے والے مسیح کے دشمن ہیں اور پوپ بھی جو کچھ گرجاگھروں میں خدا کی کلام کی تعلیم دینے کی بجائے معافی نامہ والی تعلیم دیتا ہے۔
54. خدا کے کلام کو نقصان پہنچتا ہے جب خدا کے کلام کی بجائے معافی نامہ والی تقریر کو زیادہ وقت دیا جاتا ہے۔
55. پوپ اگر ایک گھنٹی ایک جلوس اور ایک تقریب سے معافی نامہ عبادت کرتا ہے تو انجیل کا کام جو کہ بہت بڑا ہے اسے ایک سو گھنٹیوں، ایک سو جلوسوں اور ایک سو تقریبات کے ساتھ کرنا چاہیے۔
56. چرچ کا خزانہ جس میں سے پوپ خرچ کرتا ہے وہ مسیح کے لوگوں کے سامنے پوری طرح نہیں بتایا جاتا کہ وہ خزانہ کتنا ہے۔
57. اس خزانے کے بارے میں صاف طور پر اس لیے نہیں بتایا جاتا کیونکہ معافی فروخت کرنے والے تاجر یہ مفت میں نہیں دیتے بلکہ وہ لوگوں سے وصول کرتے ہیں۔
58. یہ مسیح یا مقدسوں کے معیار کے مطابق نہیں ہے حتی کہ پوپ کے بھی نہیں۔ مقدسوں کا معیار مسیح کا صلیب کا کام، رحم کا کام جو انسانوں کے لیے کیا جاتا ہے۔
59. سینٹ لوئس نے فرمایا کہ غریب لوگ چرچ کا خزانہ ہیں۔ یہ انہوں نے اپنے دور کے رواج کے مطابق بیان کیا۔
60. ہمیں ایسا کہنے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے کہ چرچ کی چابیاں ہی چرچ کا خزانہ ہے اور یہ مسیح کے معیار کے مطابق ہے۔
61. پس یہ بات صاف ہے کہ پوپ کے پاس معافی کا اختیار محدود ہے اس کی اپنی ذات تک جو وہ مخصوص حالت میں سزا کی معافی کے لیے ہے۔
62. چرچ کا اصل خزانہ مسیح کی انجیل، خدا کا جلال اور اس کا فضل ہے۔
63. اس خزانہ کی عزت کرنا واجب ہے اور یہ ہی اول اور آخر قرار دیا جائے۔
64. دوسری طرف، معافی نامہ بیچنے والوں کے نزدیک ان کا خزانہ ہی مقدم ہے انہوں نے آخر کو اول کا درجہ دے رکھا ہے۔
65. ان کے الہام کے خزانے وہ جال ہیں جن سے وہ امیر مچھلیوں کو شکار کرتے ہیں۔
66. معافی نامہ بیچنے والوں کے خزانے ایک طرح کے جال ہیں جن سے وہ آج کے دن تک امیر مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں۔
67. معافی نامہ بیچنے والے تاجر بہت بڑی حمایت کرتے ہیں وہ حمایت جو پیسہ اکھٹا کرنے کے لیے ہے۔
68. وہ کسی طور بھی مسیح کے جذبہ اور خدا کے جلال کا متبادل نہیں ہو سکتی۔

69. بشپوں اور پادریوں کو پاپائی معافی ناموں کے فرائض کی انجام دہی کے عوض مراعات ملتی ہیں۔
70. یہ لوگ پوپ کی طرف سے مقرر کردہ فرائض سے زیادہ اپنی آرزوؤں کی تبلیغ کرتے ہیں۔
71. ان کو ملعون اور مردود رہنے دو جو رسولوں کے کردار کا انکار کرتے اور معافی نامہ والی تعلیم پر چلتے ہیں۔
72. دوسری جانب ان کو بابرکت رہنے دو جو معافی کے تاجروں کے الفاظ کا انکار کرتے ہیں۔
73. اسی طرح سے پوپ اُن معافی فروخت کرنے والوں کی راہ رکاوٹ ڈالتا ہے جو اس راہ سے ہٹ کر کچھ اچھا کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔
74. جو یہ کرتے ہیں ان پر پوپ کی خاص نظر رہتی ہے جو مقدس سچائی اور محبت کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔
75. ایسا سوچنا بیوقوفی ہے کہ پوپ کے پاس جو اختیار ہے اس سے وہ ہر ایک کو معاف کر سکتا ہے حتیٰ کہ اُس نے مقدسہ مریم کے خلاف بھی گناہ کیا ہو۔
76. اس کے برعکس ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جہاں تک ان لوگوں کی غلطی کا تعلق ہے، پوپ کے پاس گناہ کے معمولی داغ کو بھی مٹانے کا اختیار نہیں ہے۔
77. ایسا کہنا پوپ اور مقدس پطرس کی توہین ہے کہ اگر پطرس آج پوپ ہوتا تو وہ بھی اس سے بڑی رحمت نہیں دلا سکتا تھا۔
78. دوسری جانب ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مقدس پطرس اور پوپ کے پاس بڑی رحمت ہو سکتی ہے۔ انجیل کے مطابق روحانی طاقتیں، شفا کی قوت وغیرہ جیسا پہلے کرنتھیوں کے 12 باب کی 28 آیت میں مرقوم ہے۔
79. ایسا کہنا توہین ہے کہ پوپ کے بازو کے اشارہ سے بنائی جانے والی صلیب اس صلیب کے برابر درجہ رکھتی ہے جس صلیب پر مسیح قربان ہوا۔
80. جو بشپ، پادری اور علما ایسی تعلیم کا اضافہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں انھیں اس بات کا جواب دینا ہو گا۔
81. اس طرح کے بے لگام تبلیغ پڑھے لکھے لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں اور وہ اس پر سوال اٹھاتے ہیں اور پوپ کی طرف سے لگائے جانے والے الزامات کو تنقید کی نظر سے دیکھتے ہیں۔
82. وہ سوال کرتے ہیں کہ پوپ سب روحوں کو ایک ہی دفعہ برزخ سے کیوں نہیں نکالتا محبت کی خاطر جو کہ روحوں کی اہم ترین ضرورت ہے۔ مگر وہ خاص لوگوں کو پیسے کے لیے نکالتا ہے۔ کیا سینٹ پیٹر چرچ صرف اس چھوٹے سے مقصد کے لیے بنایا گیا تھا؟
83. جنازہ اور یادگاری عبادت بار بار کیوں کروائی جاتی ہیں؟ بار بار ان کے لیے ادا کیوں کرنا پڑتا ہے؟ ایسا فائدہ کیوں اٹھایا جاتا ہے جب روحوں کی نجات ہو چکی تو ایسا کرنا بالکل غلط ہے۔
84. یہ کیسا جذبہ ہے کہ ایسے گناہ گار کو معاف کر دیا جائے پیسوں کی وجہ ہے جس نے خدا کے خلاف گناہ کیا ہو اور وہ پرہیز گار بھی نہ ہو۔ دوسری جانب خدا سے محبت رکھنے والی اور پرہیز گار روح کو پیسہ لیے بغیر معاف نہ کیا جائے۔
85. معافی کے لیے بنائے گئے کینن قوانین جو کہ اصل میں اب رائج نہیں ہیں ان کی بنیاد پر آج بھی پیسہ وصول کیا جاتا ہے جیسے کہ وہ قوانین آج بھی زندہ اور استعمال میں ہیں؟
86. آج جبکہ پوپ کی کمائی کسی امیر ترین شخص سے زیادہ ہے تو وہ اس پیسے سے ایک سینٹ پیٹر چرچ کیوں بنواتا بجائے اس کہ وہ

لوگوں سے پیسہ اکٹھا کرتا ہے۔

87. پوپ لوگوں کو کیا دیتا ہے کیا معاف کرتا ہے جبکہ سچی توبہ کرنے والے کا حق ہے کہ اسے معافی ملے۔

88. پوپ جو دن میں ایک بار گناہ معاف کرسکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ کام بار بار کیوں نہیں کرتا کہ کلیسیا پر فضل کا باعث بنے۔

89. اگر پوپ پیسوں کے لیے نہیں بلکہ روحوں کی نجات چاہتا ہے تو پھر معافی کے لیے سالانہ خطوط کیوں دیے جاتے اور معطل کیے جاتے ہیں جیسے کہ وہ آج بھی رائج ہوں؟

90. یہ سوالات آج کے عام لوگوں کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ طاقت کے بل ہوتے پر ان کو قائم رکھنا اور کوئی معقول وجہ بیان نہ کرتا لوگوں میں غم وغصے کا باعث ہے۔

91. اگر معافی نامہ کی تبلیغ پوپ کی روح اور مرضی سے کی گئی ہے تو ان مشکلات پر آسانی سے قابو پالیا جائے گا اور اس عمل کو روکنا ہوگا۔

92. پھر ایسے نبیوں سے چھٹکارا حاصل کریں جو مسیح کے لوگوں کو امن امن کہتے ہیں مگر امن کہیں نہیں ہے۔

93. وہ نبی مبارک ہیں جو مسیح کے لوگوں کو صلیب صلیب کہتے ہیں جبکہ یہاں کوئی صلیب نہیں ہے۔

94. مسیحی لوگوں کو چاہئے کہ وہ المسیح کی پیروی کریں اور اُسے اپنا سربراہ مانیں، سزاؤں، موت اور دوزخ کے ذریعے۔

95. اور ان کی مشکلات کی برداشت کرتے ہوئے اعتماد کے ساتھ جنت میں جانے دیا جائے بجائے اس کے کہ وہ بے یقین امن پر بھروسہ رکھیں۔[20]

مذکورہ بالا یہ وہ 95 اشکالات تھے جو مارٹن لوتھر نے اپنے زمانے مین مروجہ مسیحیت اور اس کی تعلیمات اور اہم عہدے داران کو پیش کئے۔ ان اشکالات کی بنا پر مارٹن لوتھر نے کلیسیائی نظام و انصرام کو اپنے زاویہ سے درست کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ لوتھر کے ماننے والے کیتھولک کلیسیا سے جدا ہو کر اس کے حلقہ میں داخل ہونے لگے۔ لوتھر کے انہی پیروکاروں کی وجہ سے مسیحیت میں ایک نئے گروہ یعنی پروٹسٹنٹ کلیسیا کا وجود قائم ہوا اور مغرب کی نشاۃ ثانیہ اور جدیدیت عمل میں آئی۔

نشاۃ ثانیہ (Renaissance) اور انسان پرستی (Humanism)

مذہبی آزادی اور پوپ کی بالادستی کے آزادی کے پیشِ نظر ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جس میں مذہبی رجحانات امتیازی حد تک ماند پڑ گئے تھے۔ وہ علوم جسے رومن کیتھولک اپنا اثاثہ جانتے تھے اور عوام کی اس تک رسائی کو جرم قرار دیا تھا وہ علوم اب ثانوی حیثیت میں جانے لگے اور اس کی جگہ یونانی علوم نے لے لی۔ 15 ویں صدی میں جب یونانی علوم پھیلے تو مغرب کا ذہن دوبارہ بیدار ہوا، اور اسی کو مغرب کی نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ تاہم مغرب کی اس نشاۃ ثانیہ میں وحی کی مرکزیت ختم ہوگئی۔ حسن عسکری لکھتے ہیں:

> چنانچہ 'نشاۃ ثانیہ' کا اصلی مطلب ہے، وحی پر مبنی علوم اور نقلی علوم کو بے اعتبار سمجھنا، اور عقلیت اور انسان پرستی اختیار کرنا۔ اسی لئے اس تحریک کا دوسرا نام 'انسان پرستی' (Humanism) بھی ہے۔ چونکہ نیا دور اسی زمانے میں شروع ہوتا ہے اور جدیدیت کے خدوخال نمایاں ہونے شروع ہوتے ہیں۔[21]

اس دور میں جو فکری و عملی تبدیلیاں رونما ہوئیں اس میں سے بعض اہم حسب ذیل ہیں:

- یونان کے علوم کو دین کے علوم پر راجح قرار دینا۔
- انسان پرستی یعنی انسان کو کائنات کی موجودات میں سب سے ضروری سمجھنا اور ہر فکر پر انسان کے نقطہ نظر سے غور کرنا۔

- عوام اگرچہ ایک حد تک مذہبی رنگ میں رنگے تھے اس لئے خدا کی موجودگی کا انکار تو نہیں کیا گیا مگر خدا پر ایمان محض ایک رسمی چیز بنادیا گیا۔
- از منہ وسطیٰ میں کہا جاتا تھا کہ اصل حقیقت صرف آخرت ہی ہے ، یہ دنیا تو ایک فریب ہے مگر اب لوگ کہنے لگے کہ آخرت بھی حقیقی ہے اور دنیا بھی حقیقی ہی ہے۔
- آخرت نظر میں نہیں آتی تو اس لئے اس کی فکر میں گھلنا عبث ہے لہٰذا مرنے کے بعد دیکھا جائے گا۔ دنیا سامنے ہے تو اولین طور پر پہلے اسکا بندوبست کیا جائے۔ (اس کی نظر و فکر کی مثال انگریز فلسفی بیکن ہے جو پہلا جدید مفکر کہلاتا ہے)۔
- انجیل کا مطالعہ فطرت کی روشنی میں بھی کیا جائے۔ (یہ نقطہ نظر گلیلیو کا تھا)۔
- فطرت کا مطالعہ برائے جاننے نہیں بلکہ تسخیر فطرت کے لیے ہو، تاکہ انسان فطرت کی ان قوتوں کو کارآمد بنا سکے۔
- تسخیر فطرت کا مطلب طاقت اور قوت کا حصول ہے۔ انسان کا سب سے بڑا کام یہ قرار پایا کہ طاقت کو حاصل کرلے، خواہ کوئی بھی شعبے میں ہو اور کسی بھی طریقے سے حاصل کرے۔
- جوہر اور عرض کی مباحث میں جوہر پر عرض کو ترجیح دی جانے لگی۔
- خارجی ومادی کامیابیوں نے مغربی ذہنوں کو اس حد تک متاثر کیا کہ لوگ "فکر" و "عمل" کو ایک دوسرے کا متضاد سمجھنے لگے بلکہ "عمل" یعنی خارجی اور جسمانی عمل کو بھی "فکر" پر فوقیت دی گئی۔
- مغرب میں عقل جزوی (Reason) اور تخیل کی مباحث شروع ہوئیں۔ عقل کُلی (Intellect) کو بھولا جانے لگا اور عقلِ جزوی کو عقل کُلی سمجھا جانے لگا جس کے سبب مغربی مفکرین کے دو گروہ ہو گئے۔
- مغرب کے روایتی اور دینی علوم کو تو خیر باد کہہ دیا ہے تاہم اس کے متبادل مادیّت کے رجحان کو فروغ ملا جس نے بعد میں حقیقت، صداقت یا حق کے وجود کا ہی انکار کر دیا۔
- اہمیتِ فرد کا اثبات نہ صرف نشاۃ ثانیہ میں بلکہ ساری جدیدیت کی اصل بھی یہی انفرادیت پرستی تھی۔ مذہب اور معاشرتی زندگی، غرضیکہ ہر جگہ آخری میعار فرد اور تجربے کو سمجھا گیا۔

چنانچہ اس دوران مغرب میں جتنی بھی تحریکیں سامنے آئیں وہ سب اسی نشاۃ ثانیہ کا کسی نہ کسی طرح کا جزو تھیں اور یہی وجہ ہے کہ مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح کلیسیا بھی شخصی آزادی اور فرد کی انفرادیت کی داعی رہی جو نشاۃ ثانیہ اور تحریک اصلاحِ کلیسیا کے تعلق کو واضح کرتی ہے۔

مغرب میں عقلیت پرستی

پروٹسٹنٹ کی تحریک اصلاح کلیسیا جو پندرہویں اور سولہویں صدی کی ہم ترین تحریک تھی اس کے بعد کلیسیا کے اختیار کافی حد تک ختم ہو گئے اور فرد کے اندر فکر آزادی بیدار ہوئی جس سے عقلیت پرستی کو دور شروع ہوا۔ یہ دور قریباً 17 ویں صدی کے وسط سے شروع ہو کر اٹھارویں صدی کے وسط تک چلتا ہے اور اسی دور میں 1750ء کے قریب ایک دوسرا رجحان جذبات پرستی بھی شروع ہو چکا تھا۔ سترہویں صدی میں لوگ طے کر چکے تھے کہ انسان کی جدوجہد کا میدان دنیا اور مادی کائنات ہے اور انسان کا مقصدِ حیات فطرت اور کائنات کی تسخیر ہونا چاہیے۔ انگریز مفکر "بیکن" کے فطرت کے مطالعہ کے لیے سائنسی طریقہ کار متعارف کروائے۔ اسی دور میں روح اور مادہ کے بارے میں مباحث نے زور پکڑا اور ان کی حقیقت کے بارے میں مختلف رجحانات میں بٹ گئے مگر یہ فیصلہ

ہو چکا تھا کہ انسان صرف عقل یعنی عقل جزوی اور عقل معاش پر ہی بھروسہ کر سکتا ہے کیونکہ یہی چیز تمام انسانوں میں مشترک ہے۔ عقلیت پرستی کے اس دور میں یہ بات تسلیم کرلی گئی تھی ہے کہ انسان کی رہنمائی بس عقل جزوی ہی کر سکتی ہے۔ اس دور کے سب سے بڑے امام دو ہیں: ایک تو فرانس کا فلسفی اور ریاضی دان ڈیکارٹ (Descartes) اور دوسرا یورپ کا سائنس دان نیوٹن تھا۔

مغرب میں عقلیت پرستی کا آغاز اسی بحث سے ہوا کہ روح حقیقی ہے یا مادہ۔ بعض نے کہا روح حقیقی ہے اور مادہ غیر حقیقی، بعض نے کہا روح غیر حقیقی ہے اور مادہ حقیقی۔ بعض لوگوں کا ماننا تھا کہ روح حقیقی ہے مگر مادہ ظلی طور پر کچھ حقیقت رکھتا ہے جبکہ بعض کو یہ بھی کہنے لگے تھے کہ مادہ ہی حقیقت ہے۔ اس کا حل ڈے کارٹ نے نکالا۔ عقلیت کے سرخیل ڈے کارٹ (Descartes) نے کہا کہ روح اور مادہ دونوں حقیقی ہیں مگر ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور اپنی اپنی جگہ قائم بھی ہیں۔ حسن عسکری لکھتے ہیں:

> یہ نظریہ مغربی ذہن میں اس طرح بیٹھا کہ تین سو سال سے یہ تفریق اسی طرح چلی آرہی ہے۔ روح اور جسم، روح اور مادے کا ارتباط کا مسئلہ آج تک حل نہیں ہوا۔ مغرب کے زیادہ تر مفکر جسم اور مادے میں اٹک کے رہ گئے اور اس سے اوپر نہ جاسکتے۔ کچھ مفکر روح میں لٹک گئے تو نیچے نہیں آسکتے۔ دیکارت کے فلسفے کا سب سے خوفناک نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب روح کا معنیٰ ہی بھول گیا اور ذہن یا نفس کو روح سمجھنے لگا۔[22]

جبکہ عقلیت کے دوسرے بڑے پیشوا نیوٹن نے جب کششِ ثقل کا قانون دریافت کیا تھا اور اس بات کو باور کروایا کہ یہ نظام کائنات کسی اصول اور قانون کے تحت ہی چل رہا ہے اور انسان چاہے ان کو جان کر کائنات کو مسخر کرلے اور عقل جزوی ہی وہ آلہ ہے جس سے ان قوانین کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس میں اگرچہ وقت درکار ہے مگر انسان کو امید رکھنی چاہیے کہ ایک دن وہ فطرت کو فتح کرلے گا۔ یوں نیوٹن نے کائنات کو ایک بے جان مشین اور انسان کو ایک انجینئر سے تعبیر کیا۔

نتیجہ بحث

عقلیت پرستی کا رجحان ایسا نہیں کہ اچانک وجود میں آگیا، اس میں مغربی تاریخ کے ان روّیوں کا خصوصی عمل دخل ہے جس نے انسان کو اس سوچ پر ابھارا کہ وہ شخصی غلامی سے نکل کر روشن خیالی کی طرف راہ لیں۔ اس تناظر میں مغرب میں پاپائی نظام اور پوپ کے ریاست اور مذہبی زندگی میں بے جا دخل نے اہم کردار ادا کیا، حتیٰ کہ جب مغرب کے مذہبی پیشواؤں نے انہیں جکڑ کر رکھ دیا تو نشاۃ ثانیہ، نئی دنیا اور اصلاح کے نام پر ایسی تحریکیں سامنے آئیں جو مذہبی پیشوائیت کے خلاف کھڑی ہوئیں جنہوں نے فکری غلامی سے رہائی دلوائی تاہم اس فکری غلامی سے آزادی کے ساتھ ایسے افکار بھی سامنے آئے جو انسان کو ہی عقل کل کہلوانے کے داعی رہے اور انسانی زندگی میں وحی کی مرکزیت کو ختم کرگئے جس کے سبب مغرب میں عقلیت پرستی اور فطرت پرستی کا رجحان پیدا ہوا۔

حوالہ جات وحواشی

---

[1] فیروز دین، مولوی، **فیروز اللغات**، (لاہور: فیروز سنز، 2010ء)، 1/1026۔

[2] سرہندی، وارث، **علمی اردو لغت**، (لاہور: علمی کتب خانہ، 1976ء)، ص1149۔

[3] خویشگی، محمد عبداللہ خان، **فرہنگ عامرہ**، (خورجہ یو۔پی: فیروز منزل، 1937ء)، ص412۔

[4] جالندھری، عبدالحکیم، **قائد اللغات**، (لاہور: حامد اینڈ کمپنی، سن ندارد)، 2/729۔

[5] خیر اللہ، ایف۔ ایس، **قاموس الکتاب**، (لاہور: مسیحی اشاعت خانہ، سن ندارد)، ص804۔

[6] قاسمی، غلام رسول، **عیسائیت سے اسلام تک**، (سرگودھا: رحمۃ للعالمین پبلیکیشنز، سن ندارد)، ص21۔

[7] خیر اللہ، **قاموس الکتاب**، ص804۔

[8] Concilium Chalcedonense, www.patristica.net, Retrieved: 29 Aug 2023, 06:30 PM.

[9] J. A. Wylie, **The Papacy: Its History, Dogmas, Genius and Prospects**, (London: Johnstone and Hunter, 1851, 2nd Edition), P.18.

[10] خورشید عالم، پادری، **تواریخ کلیسیائے رومۃ الکبریٰ**، (لاہور: پنجاب ریلجئس بک سوسائٹی، 1961ء)، 1/ 15–18۔

[11] Rome Empire (27 BC–476 AD), Civitatis Rome, www.rome.net, Retrieved: Sep 03, 2023, 08:10 PM.

[12] خورشید عالم، **تواریخ کلیسیائے رومۃ الکبریٰ**، 1/ 19–24۔

[13] رچرڈ ڈالینجر، ڈاکٹر، **اصلاح کلیسیا ختم نہیں ہوسکتی**، (گوجرانوالہ: مکتبہ عناویم پاکستان، سن ندارد)، ص22۔

[14] Peter Frankopan, **The History of The Seljuq Turks**, (Surrey: Curzon Press, 2001), P. 3.

[15] Peter Frankopan, The First Crusade: The Call from East, (Cambridge: The Belknap of Harvard University Press, 2012), P.1.

[16] خورشید عالم، **تواریخ کلیسیائے رومۃ الکبریٰ**، 1/ 102۔

[17] حسن عسکری، ڈاکٹر، **جدیدیت**، (لاہور: ادارہ فروغ اسلام، 1997ء)، ص32۔

[18] ایضاً، ص36۔

[19] خورشید عالم، پادری، **تحریک اصلاحِ کلیسیا**، (اسلام آباد: بیت الشمس کرسچن بک سروس، 2004ء)، ص89۔

[20] Jonh Dillenberger, **Martin Luther: Selection from his Writings**, (New York: Anchor Books Doubleday & Company, Inc, 1961), P. 490.

[21] حسن عسکری، **جدیدیت**، ص39–40۔

[22] ایضاً، ص49۔